نظیر اکبرآبادی کی نظمیں

حقانی القاسمی

معرفت عابدانور، D-64، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی۔110025، موبائل: 9891726444

سلیم احمد نے لکھا تھا کہ عورت کی طرح شاعری بھی پورا آدمی مانگتی ہے۔

نظیر اکبرآبادی کے تخلیقی طرز اور تفاعل کو دیکھا جائے تو وہ 'نظم کا پورا آدمی' کی حیثیت میں سامنے آتے ہیں۔ ایسا ہی آدمی زندگی کو اس کی کلیت اور تضادات کے ساتھ بسر کرتا ہے۔ وہ ہر اس شے سے سروکار رکھتا ہے جس میں تنوع، بوقلمونی اور رنگا رنگی ہو۔ ایسا آدمی زندگی کے ہر منظر سے لذت اور تجربہ کشید کرتا ہے۔ یہ تنہائی کے زنداں میں قید نہیں رہتا بلکہ بھیڑ کا حصہ بن کر حیات و کائنات کو متنوع اور مختلف زاویوں سے دیکھتا ہے اور ایک نیا طرز حیات تشکیل دیتا ہے۔ وہ اپنا فلسفۂ حیات تنہائی نہیں ہجوم سے ترتیب دیتا ہے۔

نظیر اکبرآبادی بھیڑ کے شاعر تھے۔ میلے ٹھیلے، کھیل تماشے ان کے تخلیقی محرکات تھے۔ عوامی جذبات و احساسات ان کے تخیل اور تخلیق کو مہمیز کرتے تھے۔ وہ عوام کے شاعر تھے۔ انھوں نے ان موضوعات اور مسائل کو اپنی شاعری کا مرکز بنایا جن کا رشتہ عوام سے تھا۔ عوام ہی ان کی شاعری کا خاص کردار ہیں۔ عوامی معمولات اور مشاغل سے ان کا تعلق ہمیشہ برقرار رہا۔ تیراکی، کبوتر بازی، ورزش، کشتی یہ سارے مشغلے اختیار کئے اور ان مشغلوں نے انہیں جن تجربات سے گزارا ان کی عکاسی انھوں نے بڑی عمدگی سے اپنی نظموں میں کی ہے۔

نظیر اکبرآبادی نے عوامی معاشرت اور ثقافت کے سارے رنگ اپنی نظمیہ شاعری میں اس طرح سمو دیے ہیں کہ نظیر کی شاعری ہندوستانی سماجیات اور عمرانیات کا ایک مستحکم حوالہ بن گئی ہے۔ سماجیاتی تناظر میں ان کی شاعری کا مطالعہ کرنے سے معاشرت کے بہت سے زاویے سامنے آتے ہیں۔ ان کے ہاں مختلف معاشرتوں کے مظہر ہیں۔ مختلف طبقات کے احساسات ہیں۔ وہ فرد یت نہیں اجتماعیت کے شاعر تھے۔ اسی لیے نظیر اکبرآبادی کی شاعری ذات کا نوحہ نہیں معاشرے کی داستان نظر آتی ہے۔ وہ لوک کتھائیں جن میں پورے ہندوستان کا سماج اپنے تمام رنگوں کے ساتھ موجود ہے۔ ان کے ہاں طبقہ اشرافیہ کا پیدا کردہ معاشرتی جمود و تعطل نہیں تھا بلکہ ایک ایسا تحرک تھا جس نے ان کے حواس کو تجربات اور مشاہدات کے بیش بہا خزانے عطا کئے۔ انھوں نے عوامی اور جمہوری آوازوں سے اردو شاعری کو روشناس کرایا۔ ایک عام آدمی کو بھی نظیر کی شاعری میں اپنے دل کی آواز سنائی دیتی ہے۔ نظیر کی نظم 'روٹیاں' پڑھتے ہوئے ایک عام آدمی کو احساس ہوتا ہے کہ یہ اسی کی ذات اور زندگی سے جڑا ہوا مسئلہ ہے۔ وہ بھی نظیر کی طرح یہ سوچتا ہے:

جب آدمی کے پیٹ میں آتی ہیں روٹیاں
پھولی نہیں بدن میں سماتی ہیں روٹیاں
آنکھیں پری رخوں سے لڑاتی ہیں روٹیاں
سینے اوپر بھی ہاتھ چلاتی ہیں روٹیاں
جتنے مزے ہیں سب یہ دکھاتی ہیں روٹیاں

اسی طرح غربت اور بدحالی کا شکار آدمی جب نظیر کی نظم 'مفلسی' پڑھتا ہے تو افلاس کے جانے کتنے زاویے اس کی نگاہوں میں روشن ہوجاتے ہیں اور اسے محسوس ہوتا ہے کہ مفلسی سے بڑھ کر کوئی عذاب نہیں۔ یہ نظم صرف ذہن نہیں اس کی روح میں اتر جاتی ہے اور 'زوال آدمیت' کی منزلوں سے روشناس کراتی ہے:

جب آدمی کے حال پہ آتی ہے مفلسی
کس کس طرح سے اس کو ستاتی ہے مفلسی
پیاسا تمام روز بٹھاتی ہے مفلسی
بھوکا تمام رات سلاتی ہے مفلسی
یہ دکھ وہ جانے جس پہ کہ آتی ہے مفلسی
کہیے تو اب حکیم کی سب سے بڑی ہے شان
تعظیم جس کی کرتے ہیں نواب اور خاں

مفلس ہوئے تو حضرت لقمان کیا ہیں یاں
عیسیٰ بھی ہو تو کوئی نہیں پوچھتا میاں
حکمت حکیم کی بھی ڈباتی ہے مفلسی

یہ نظم مادیت کی معنویت کو روشن نہیں کرتی بلکہ زندگی کی ایک بڑی حقیقت سے پردہ اٹھاتی ہے اور ایسی چھوٹی چھوٹی حقیقتیں معاشرت سے اختلاط اور میل جول کے نتیجے میں سامنے آتی ہیں۔

نظیر اکبرآبادی کی پوری نظمیہ شاعری ایسی ہی معاشرتی حقیقتوں کی آئینہ دار ہے۔ انھوں نے کتابوں کے قدیم فلسفوں اور نظریوں کو اپنا ذہنی محور نہیں بنایا بلکہ زندگی کے مشاہدات جن تجربوں سے آشنا کرتے گئے، وہی تجربے ان کی شاعری میں ڈھلتے گئے۔ نظیر نے اپنی شاعری پر ان فلسفوں کا بوجھ نہیں ڈالا جو آج کے صنعتی معاشرے میں اپنی معنویت کھو چکے ہیں بلکہ زندگی کی ان ابدی صداقتوں سے اپنا رشتہ جوڑا جنہیں زمانے کی بدلتی ترجیحات بھی نہیں جھٹلا سکتیں۔

نظیر کی شاعری میں آدمی کی ان بنیادی جبلتوں کا اظہار ہے جو ارتقائے انسانی کے باوجود تبدیل نہیں ہوسکتیں۔ 'آدمی نامہ' نظیر اکبر آبادی کی ایسی ہی نظم ہے جس میں انھوں نے آدمی کو اس کے تمام اضداد، طاقت، کمزوری، نیکی، بدی، کمینگی اور شرافت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ نظیر کی یہی حقیقت پسندی ہے جس نے ان کی نظموں کو مقبولیت کے ساتھ ساتھ امتیاز و اعتبار بھی عطا کیا ہے۔ 'آدمی نامہ' ان کے ذہنی مساوات کا ہی نہیں بلکہ فلسفۂ بشریت کا بھی مظہر ہے۔ آدمیت کی اس سے بہتر تعبیر و تفسیر نہیں ہوسکتی:

دنیا میں بادشہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی
اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زردار، بے نوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے جو مانگتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ابدال و قطب و غوث ولی آدمی ہوئے
منکر بھی آدمی ہوئے اور کفر کے بھرے
کیا کیا کرشمے کشف و کرامات کے لئے
حتیٰ کہ اپنے زہد و ریاضت کے زور سے
خالق سے جاملا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

نظیر کے یاں کوئی بھی مخلوق مہمل نہیں ہے۔ وہ قدرت کی ہر مخلوق کو کائنات کے لیے کارآمد تصور کرتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ کائنات کا سارا نظام اضدادی جوڑے پر مبنی ہے۔ روشنی کے لئے تاریکی ضروری ہے۔ اس کے بغیر روشنی کی اہمیت سمجھ میں نہیں آسکتی۔

نظیر کے شعری دربار میں سبھی کردار ایک ہوجاتے ہیں۔ کیا امیر و فقیر کیا مفلس و غنی۔

نظیر کے ذہن و دل دونوں ہی کشادہ تھے۔ ان کی نظموں کی بھی وسعت اور کشادگی ہے کہ انہیں ہر طبقہ، ہر فرقہ میں محبوبیت اور مقبولیت نصیب ہوئی۔ مذہب ہو یا معاشرت ہر باب میں ان کا کھلا ہوا آزادانہ رویہ تھا۔ وہ کسی طرح کے امتیاز اور تفریق کے قائل نہیں تھے۔ مذہب کے تعلق سے ان کا نظریہ اتنا وسیع تھا کہ اپنی ایک نظم میں کہتے ہیں:

کل عالم تیری یاد کرے تو صاحب سب کا سچا ہے
کوئی خالق باری سب مولا رحمان رحیم تنگری
کوئی الکھ روپ کرتار کہے ترکال نرنجن گردھاری
کوئی رام رام کہہ کر سمرے کوئی بولے شیوشیو ہری ہری

نظیر اکبرآبادی نے تہواروں اور تقریبات میں بھی کوئی تفریق نہیں برتی۔ عید ہو یا دیوالی، ہولی ہو یا شب برأت، بسنت ہو یا رکشا بندھن۔ ہر ایک پر نظمیں کہیں۔ عید پر تو انھوں نے صرف چار نظمیں کہی ہیں، مگر ہولی پر گیارہ، بسنت پر تین، دیوالی پر دو لکھی ہیں۔ یہ نظمیں ان کے مزاج اور طبیعت کی غماز ہیں اور اس بات کا بھی احساس دلاتی ہیں کہ نظیر زندگی کی مسرتوں سے لطف اندوزی کے قائل تھے۔ مسرت یا خوشی کا موقع کہیں سے بھی نصیب ہو وہ اس کو گنوانا نہیں چاہتے تھے۔ وہ عام انسانی مسرتوں میں مذہب کو حائل نہیں ہونے دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ہولی پر نظمیں لکھیں تو پورے وفور جذبات کے ساتھ یوں لکھا کہ ہولی کی ساری شوخیاں شاعری میں سمٹ آئیں:

ہر آن خوشی سے آپس میں سب ہنس ہنس رنگ چھڑکتے ہیں
رخسار گلالوں سے گلگوں کپڑوں سے رنگ ٹپکتے ہیں
کچھ راگ اور رنگ جھلکتے ہیں کچھ مے کے جام چھلکتے ہیں
کچھ کودیں ہیں کچھ اچھلیں ہیں کچھ ہنستے ہیں کچھ بکتے ہیں

یہ طور یہ نقشۂ عشرت کا ہر آن بنایا ہولی نے

ہولی کے اس بیانیہ میں نظیر کی شوخیِ طبیعت اس طرح گھل مل گئی

ہے کہ نظیر کا پورا رومانی مزاج اور تہذیبی دید بازی کا شوق سامنے آجاتا ہے۔

دیوالی پر لکھی نظم میں بھی نظیر کی اسی شوخی اور کھلنڈرے پن کا نظارہ ملتا ہے:

ہر اک مکاں میں جلا پھر دیا دوالی کا
ہر اک طرف کو اجالا ہوا دوالی کا
سبھی کے دل میں سماں بھا گیا دوالی کا
کسی کے دل کو مزا خوش لگا دوالی کا
عجب بہار کا ہے دن بنا دوالی کا

نظیر اکبرآبادی کی شاعری میں نشاط کا یہ رنگ اس لئے بھی ہے کہ نظیر جس کردار سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے وہ کرشن کنہیا کا کردار تھا۔ نظیر نے جتنی وارفتگی، شیفتگی کے ساتھ کرشن جی پر نظمیں لکھی ہیں شاید ہی ہندی کے کویوں نے اتنی عقیدت کے ساتھ لکھی ہوں گی۔ کرشن جی نظیر کے لیے ایک آئیڈیل تھے۔ اس لیے اس کردار میں مکمل طور پر محو ہوکر انھوں نے کنہیا جی کی راس، جنم کنہیا جی جیسی نظمیں لکھیں۔

بھکتی رس میں ڈوب کر نظیر نے کرشن جی پر ایک طویل نظم لکھی جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کرشن جی کے کوائف اور کردار سے نہ صرف واقف تھے بلکہ خود اس کردار میں تحلیل ہوگئے تھے۔ کنہیا کی بانسری سے مست ہوکر نظیر نغمۂ محبت وعقیدت یوں چھیڑتے ہیں:

سب ناری آئیں گوکل کی اور پاس پڑوسن آ بیٹھیں
کچھ ڈھول مجیرے لاتی ہیں کچھ گیت بجا کے گاتی ہیں
کچھ ہردم مکھ اس بالک کا بلہاری ہوکر دیکھ رہیں
کچھ تھال پنجیری کے رکھتیں کچھ سونٹھ سنٹھورا کرتی تھیں
کچھ کہتی تھیں ہم بیٹھے ہیں نیگ آج کے دن کا لینے کو
کچھ کہتیں ہم تو آئے ہیں آنند بدھاوا دینے کو

کرشن کی شخصیت سے نظیر اتنے متاثر تھے کہ انھوں نے کرشن کے اتنے ناموں کا اپنی نظموں میں استعمال کیا ہے کہ کرشن بھکت بھی شاید واقف نہ ہوں۔ مرلی دھر بجیا، گوؤ چریا، مہر کریا، جوگی بھیا۔ من موہن کرشن کنہیا۔ کرشن کی پوری اساطیری شخصیت / پیکر کو انھوں نے اپنی نظمیہ شاعری میں ڈھال دیا ہے۔

کرشن کنہیا کے بالپن سے لے کر ان کی راس تک کا بیان نظیر نے جس فن کاری کے ساتھ کیا ہے ایسی ہنرمندی تو ہندو شاعروں کو بھی شاید ہی نصیب ہوئی ہوگی۔

نظیر اکبرآبادی نے شیو جی اور پاروتی کے بیاہ کی کتھا بھی اس انداز سے بیان کی ہے کہ یقین ہی نہیں آتا کہ نظیر جیسا آزاد منش، قلندر صفت آدمی ہندی اساطیری علامات اور استعارات کا اتنا بڑا گیانی ہوگا۔

نظیر نے متھرا، گوکل، برندابن جیسے رومانی علاقوں سے اپنا فکری رشتہ اس طرح استوار کیا کہ ان علاقوں کی ہر اشارت، عبارت، ادا ان کی نظمیہ شاعری کے فکری اور لفظیاتی نظام کا حصہ بن گئی۔

نظیر نے ان علاقوں کی بولیوں اور الفاظ کو بھی اپنی نظمیہ شاعری میں نگینہ کی طرح سجایا ہے۔ یہ پراکرت سے ان کے ذہنی رشتے کا پتہ دیتے ہیں۔

نظیر نے نظمیہ شاعری کو نئے رنگ وآہنگ عطا کئے ہیں اور یہ رنگ وآہنگ انہی علاقوں سے مستعار ہیں جہاں سے نظیر کی آنکھوں کا گہرا رشتہ رہا ہے۔ ان کی پوری نظمیہ شاعری میں ہندوستانیت کی جو سوندھی سوندھی خوشبو ہے، مٹی کی جو مہک ہے، موسموں کے جو رنگ ہیں، وہ ان کے گہرے مشاہدات اور تجربات کا ثمرہ ہیں۔ ہندوستانی معاشرت اور تہذیب کا ہر رنگ ان کی شاعری کا عنوان بنا ہے۔ ہندوستان کے موسم ہوں یا پھل پھول، ہندوستان کا ہر ذرہ ان کی شاعری کا آفتاب ہے۔ موسم برسات یا گرما، زمستاں کا موسم ہو یا ہنس نامہ نظیر اکبرآبادی ہر نظم میں اپنی انفرادی لفظیات اور فکریات کے ساتھ عوام کے روبرو ہوئے ہیں۔

نظیر کی نظموں کا جہان بہت وسیع ہے۔ ان کے ہاں تنوع ہے۔ رنگا رنگی ہے۔ گلہائے رنگا رنگ نے ان کی شاعری کے چہرے کو جو شادابی اور شگفتگی عطا کی ہے وہ بہت کم شاعروں کو نصیب ہوتی ہے۔ موضوعاتی تنوع اور رنگا رنگی کا ہی جلوہ ہے کہ مولانا عبدالباری آسی نے نظیر اکبرآبادی کو ایران کا سعدی اور انگلینڈ کا شیکسپیئر کہا ہے اور کلیم الدین احمد جیسا سخت گیر ناقد بھی یہ کہنے پر مجبور ہوا کہ اردو شاعری کے آسمان پر نظیر اکبرآبادی کی ہستی تنہا ستارہ کی طرح درخشاں ہے۔

مگر نظیر کو یہ درخشانی مدتوں بعد ملی ورنہ تو نظیر کو عامیانہ شاعری کے زمرے میں رکھ کر نظر انداز ہی کیا جاتا رہا۔ ان کی شاعری کو ناقابل اعتنا

ٹھہرایا گیا، مگر وقت بدلا تو وہی نظیر بے نظیر شاعر ہو گیا۔ ایک ایسا عوامی شاعر جس کی شاعری سے واقعیت اور جمہوریت کا آغاز ہوتا ہے اور جو نظمیہ شاعری کا امام قرار پاتا ہے۔

نظم کا یہ شاعر پہلے غزل میں طبع آزمائی کرتا تھا اور جس کی نوجوانی کی ایک غزل سن کر میر تقی میر جیسے خدائے سخن بھی چونک پڑے تھے، مگر نظیر نے غزل سے اپنا رشتہ زیادہ قائم نہیں رکھا۔ نظم کو اپنا میدان عمل بنایا اور ایسی شاہ کار نظمیں لکھیں کہ نظمیہ شاعری کا باب نظیر کے بغیر نامکمل سمجھا جاتا ہے۔

دلی میں پیدا ہونے والا ولی محمد آگرہ جا کر نظیر اکبرآبادی بنا اور شہرت ومقبولیت کی ساری بلندیاں اس کے نصیب میں آ گئیں کہ دراصل نظیر ایک فقیر کی دعا تھے۔ بارہ بھائی بہنوں کی موت کے بعد میر محمد فاروق کی اولاد میں زندہ بچنے والے صرف نظیر ہی تھے۔ اس فقیر نے دعا دی تھی کہ یہ بچہ نہ صرف زندہ رہے گا بلکہ اس کی خوشبو دور دور تک پہنچے گی۔

فقیر کی دعا قبول ہوئی اور نظیر شاعری کے باب میں بے نظیر ہو گئے کہ ڈاکٹر اشپرنگر جیسے صاحب نظر نے یہ لکھ دیا کہ نظیر ہی ہندوستان کا واحد شاعر ہے جو مغربی شاعری کے معیار پر پورا اترتا ہے۔

اشپرنگر کے اس خیال سے چاہے اتفاق نہ کیا جائے، مگر یہ حقیقت ہے کہ نظیر اکبرآبادی نے مروجہ شعری روایات اور اسالیب سے انحراف کر کے ایک نئی طرز اختیار کیا اور فارسی روایت کے بجائے ہندوستانی روایت اور مقامیت پر زیادہ توجہ دی۔ ان کی شاعری میں ہندی الفاظ کا جو گنج گراں مایہ ہے، وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ انھوں نے اس زمانے کی روش اور روایت کے برعکس اپنا لفظیاتی نظام تشکیل دیا۔

نظیر نے زندگی کے تضادات کو اپنی شاعری کا محور بنایا، اسی لیے ان کے یہاں تصوف اور بوالہوسی دونوں متضاد لہریں چلتی ہیں۔ ایک طرف بنجارہ نامہ جیسی نظم ہے تو دوسری طرف لطف شباب، عاشق نامہ جیسی نظمیں ہیں۔

نظیر مست مولا شاعر تھے اس لیے دونوں لہروں کے ساتھ ان کا نباہ ہو گیا، مگر اس مستی میں بھی نظیر نے مستقبل کی آہٹوں کو محسوس کر لیا تھا جبکہ دانشورانہ نگاہیں امروز میں الجھ کر رہ گئی تھیں یا ماضی میں مست تھیں۔

۶ راگست ۱۸۳۰ء کو راہیِ ملک عدم ہونے والے نظیر آج بھی زندہ ہیں کہ ان کے شعروں نے نہ صرف زندگی گزارنے، بسر کرنے کے آداب سکھائے بلکہ نشاط زیست کا بھی سامان کیا۔

○○

قلمکاروں سے گزارش

- ہمیں آپ کی گراں قدر نگارشات کا بہت بڑا ذخیرہ بذریعہ ڈاک وای۔میل موصول ہوتا ہے جس میں زیادہ تر مضامین، شاعری اور افسانے/کہانیاں ہوتی ہیں، وقت کی کمی کے باعث سب کا جواب دینا یا نگارشات واپس کرنا ممکن نہیں ہوتا، اس کو آپ ہماری بے رخی پر محمول نہ کریں بلکہ ہماری مجبوری سمجھیں۔ اگر تین ماہ کے اندر آپ کی تخلیق شائع نہ ہو یا اشاعت کے بارے میں اطلاع نہ ہو تو اس کا مطلب ہے کہ ادارہ اس کی اشاعت سے قاصر ہے۔
- قلمکاروں سے ایک گزارش اور ہے کہ وہ اپنی تخلیقات کے ساتھ اپنے بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات جن میں بینک اکاؤنٹ میں درج نام، اکاؤنٹ نمبر، بینک کا نام اور برانچ اور بینک IFSC کوڈ جو پاس بک اور چیک پر درج ہوتا ہے ضرور بھیجیں تاکہ تحریر شائع ہو جانے پر اعزازیہ بینک کے ذریعہ ٹرانسفر کیا جا سکے۔
- قلمکاروں سے ایک گزارش اور ہے کہ بذریعہ ای۔میل اپنی تخلیقات بھیجنے سے قبل اپنی تخلیقات کو ایک بار ضرور پڑھ لیں تاکہ اس میں پروف کی غلطیاں کم سے کم رہیں۔

—ادارہ